ڈاکٹر معین الدین عقیل

اُردو میں لسانی تحقیق: روایت اور مسائل ☆

اُردو میں روایتی اور تاریخی اصولوں کے تحت لسانی تحقیق کا آغاز حافظ محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی سے ہوتا ہے۔ پھر اگرچہ وحید الدین سلیم اور پنڈت کیفی نے اس میں مفید اضافے کیے، لیکن جدید علمِ زبان سے استفادے کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور عبدالقادر سروری نے اس ضمن میں وقیع کام کیے۔ بعد میں اس کام کو ڈاکٹر مسعود حسین خان نے جدید سائنٹی فک اصولوں کی روشنی میں آگے بڑھایا۔ ان کے ساتھ اس کام میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شریک ہو گئے۔ لیکن دراصل اُردو کے جدید لسانی مطالعے میں سب سے اہم اور اولین نام ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا ہے جنھوں نے ۱۹۲۹ء میں لندن میں ''ہندوستانی صوتیات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا، پھر پیرس میں ہندوستانی کے گجراتی اسالیب پر بھی مقالہ لکھنا شروع کیا تھا، لیکن اسے پورا نہ کر سکے۔ اس وقت تک نہ صرف اُردو بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی جدید لسانیاتی مطالعے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود اب لسانیات کے باب میں اُردو، بقولِ ڈاکٹر گیان چند ''ہندی سے پچیس سال پیچھے ہے''۔ حالاں کہ ۱۹۲۸ء تک محض شیام سندر داس کی ''بھاشا وگیان'' ہندی لسانیات کی کل کائنات تھی۔

☆ یہ مقالہ دراصل اس توسیعی خطبے پر مبنی ہے، جسے مقالہ نگار نے اولاً اوسلو یونیورسٹی (ناروے) میں ۲۲/ اپریل ۱۹۸۷ء کو ''شعبۂ زبانہائے مشرقی'' کی دعوت پر دیا تھا۔

ڈاکٹر زور کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خان، انور شبنم دل، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جدید لسانیات کے اصولوں اور وسائل کو اُردو کی لسانی اور صوتی تحقیق میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے جدید علمِ لسانیات کے حامل شعور نے اُردو کی لسانی تحقیق و مطالعے کی تاریخ میں اپنے مدلل مباحث کے ذریعے صراطِ مستقیم دکھائی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اُردو کی لفظی تشکیل پر جو تحقیق و تجزیاتی مقالہ "A Phonetic and Phonological Study of a Word" لکھا، وہ بہت قابل قدر تھا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اس نوع کے مقالات بھی اُردو لسانیات کے باب میں اہم اضافوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اُردو زبان، قواعد اور لغات کے تعلّق سے اس دوران جو تحقیقی مقالات بھارت اور پاکستان کے مختلف اصحابِ علم نے لکھے، ان میں بھی کہیں کہیں جدید لسانی شعور کا استعمال نظر آتا ہے۔ غیر ممالک میں ایسی کوششیں زیادہ وقیع اور سائنٹی فک بنیادوں پر ہوئیں۔ اس موضوع پر زیادہ مستقل کام روس کے مختلف لسانی تحقیق کے مراکز میں ہوا۔ روسی ماہرین نے اُردو کی صرفی ونحوی خصوصیات کے تعین میں مستقل اہمیت کے مقالات لکھے۔ یہ سب کوششیں حال کی ہیں، جن میں اُردو کے لسانیاتی مطالعے کو اہمیت دی گئی ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں اس نوع کی کوششیں بہت کم ہوئی ہیں۔ جدید لسانیاتی مطالعے اور تجزیے کی ایک موثر اور مستقل کوشش انور شبنم دل نے ضرور کی ہے، جو "Linguistic Research Group of Pakistan" کے داعی اور اس کے سب سے فعال رکن بھی رہے ہیں۔ انھوں نے پاکستان میں جدید لسانیات کے مطالعے کو فروغ دینے کی اپنی بساط بھر بڑی مثبت کوششیں کیں، کئی مطالعے کیے، اور لسانی مطالعوں پر مشتمل کئی مجموعۂ مقالات شائع کیے۔ انھوں نے اپنے ان مقاصد کے تحت پاکستانی لسانیات کے مطالعے کا جو ایک محدود لیکن مفید حلقہ تشکیل دیا تھا، اس سے وابستہ ماہرینِ لسانیات نے مختلف نوع کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے کیے۔ خود انور شبنم دل نے جدید لسانیاتی اصولوں اور طریقۂ کار کی مدد سے اُردو جملوں کی ساخت کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ "An out line of Urdu sentence structure" تصنیف کیا۔ افسوس کہ انھوں نے اس نوع کے چند کام کرنے کے بعد پاکستان کو خیر باد کہہ دیا۔ پاکستان میں اس نوع کا کوئی اور اجتماعی کام پھر کبھی نہ ہوا۔ واحد انفرادی کوشش جو جدید لسانیاتی مطالعے کے باب میں اُردو کے تعلّق سے ہوئی، وہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے انجام دی۔ اُردو کے ماہرینِ لسانیات

میں سے حافظ محمود شیرانی وغیرہ نے جو کام کیے تھے، وہ ایک لحاظ سے محض لسانیاتی پہلوؤں کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش تھیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے علمِ لسانیات پر اپنے مضامین کے ذریعے توضیحی لسانیات اور صوتیات پر لکھنے کی ابتدا کی۔ لسانیات سے ان کی یہ دل چسپی روز افزوں رہی، چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں ''لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز'' سے منسلک ہو کر شمالی ہند میں ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء'' کے موضوع پر اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ اس مطالعے کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف ہند آریائی زبانوں کے قدیم ترین نمونوں کا دردستان کی زبانوں ''شینا'' وغیرہ سے سراغ لگانے کی کوشش کی جائے اور دوسری طرف پنجابی، سندھی، اُردو وغیرہ کے لسانی پس منظر کا مطالعہ کیا جائے۔

لسانی تحقیق کے ضمن میں ایک تو وہ کام اہمیت رکھتا ہے جو اُردو کے آغاز کے نظریے اور اس کی علاقائی حد بندی سے تعلّق رکھتا ہے۔ اس کام کا آغاز ۱۹۲۳ء میں اس وقت ہوا تھا جب نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' شائع کی تھی اور اس میں انھوں نے دکن کو اُردو کا مولد قرار دیا۔ پھر محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی، جس میں انھوں نے پنجاب کو اُردو کے آغاز کی سرزمین ثابت کرنے کوشش کی۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد اُردو زبان کے آغاز کے ضمن میں محققین میں اس سمت میں مطالعہ و تحقیق کا رجحان پیدا ہوا۔ برعظیم کے تقریباً تمام علاقوں میں اُردو کے ارتقاء اور ان کی اُردو خدمات کا تحقیقی جائزہ لیا جانے لگا۔ اس ضمن میں ''میسور میں اُردو''، ''مدراس میں اُردو''، ''بنگال میں اُردو''، ''بھوپال میں اُردو''، ''بمبئی میں اُردو''، ''بہار میں اُردو''، ''گجرات میں اُردو''، ''سندھ میں اُردو''، ''ناگ پور میں اُردو''، ''یوپی میں اُردو'' جیسے جائزے مرتب ہونے لگے۔ محققین نے ہر علاقے کے قدیم ادب کو بڑی محنت سے تلاش کر کے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس طرزِ تحقیق سے اُردو زبان کے قدیم ادب کا بیش قیمت سرمایہ دریافت ہوا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں اُردو لسانی تحقیق کا فی الحقیقت بہت بڑا کارنامہ انجام دیا اور اُردو کی ابتدا کے موضوع پر سنجیدہ تحقیق کا راستہ ہموار کیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق اُردو پنجاب کے علاقے میں وجود میں آئی اور اس کی ابتدائی شکل ہریانی زبان ہے۔ اور چوں کہ نواحِ دہلی کی تمام بولیاں مسلمانوں کی فتحِ دہلی سے فروغ پاتی ہیں اور مسلمان پنجاب سے ہو کر دہلی جاتے رہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔

بعد میں ہریانی پر ڈاکٹر زورؔ نے بھی اپنی مؤقر تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' (۱۹۳۲ء) میں زور دیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ''مقدمۂ تاریخ زبان اُردو'' (۱۹۴۷ء) میں یہ ثابت کیا کہ ہریانی زبان پرانی اُردو کی باقی ماندہ شکل نہیں بلکہ ایک علاحدہ اور مستقل زبان کی حیثیت سے عرصے سے مضافاتِ دہلی میں رائج تھی۔ ڈاکٹر صاحب کھڑی بولی کو اُردو کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اپنے تحقیقی نتائج تک پہنچے تھے۔

گذشتہ نصف صدی میں اس موضوع پر ایک بڑا وقیع کام ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کیا۔ ان کی تصنیف ''اُردو زبان کا ارتقاء'' (ڈھاکا، ۱۹۵۶ء) اپنے موضوع پر نئی سمتوں کا تعین کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں محمود شیرانی اور مسعود حسین خان دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نظریہ وضع کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق مغربی ہندی، جس کو کھڑی بولی اور برج کا ماخذ بتایا جاتا ہے، ایک فرضی اور خیالی زبان ہے۔ اس علاقے میں کبھی کوئی مشترک زبان رائج نہیں رہی۔ ''پرتھوی راج راسو'' کی زبان برج بھاشا ہے — قدیم ہندی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اُردو کی صرفی ونحوی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کا ماخذ شورسینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں — اُردو، ہندوستانی یا کھڑی بولی، قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک ہے، جو ترقی کرتے کرتے اس حالت تک پہنچی ہے، جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اُردو اور پالی کا منبع ایک ہے۔ پالی، ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی، روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی زبان کا درجہ پا کر ٹھہر گئی، لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے برابر بنتی سنورتی اور ترقی پاتی رہی''۔

جن دیگر حضرات نے اُردو کے آغاز اور اس کے مولد پر اظہارِ خیال کیا ہے، ان میں پیر حسام الدین راشدی بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مقالے ''اُردو زبان کا اصلی مولد سندھ'' (مشمولہ ''اُردو'' کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء) میں سندھ کو اُردو کا اولین مولد قرار دیا ہے۔ اس نظریے کو اوّلاً سیّد سلیمان ندوی نے پیش کیا تھا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر کہ ''سندھ، پنجاب اور دکن میں جو زبانیں بنیں وہ اُردو نہیں بلکہ بالترتیب سندھی، پنجابی اور دکنی تھیں'' اپنے نظریے سے رجوع کر لیا تھا۔ فاضل مقالہ نگار کے نظریے کا ماحصل یہ ہے کہ سندھ میں سب سے پہلے مسلمانوں کو برعظیم کی دیگر اقوام سے ملنے اور پھر ربط ضبط بڑھانے کا موقع ملا تھا اور یہیں سب سے پہلے ان کی عربی زبان، دیسی زبان سے

خلط ملط ہوئی۔ عین الحق فرید کوٹی نے اس موضوع پر اپنی ایک ضخیم تصنیف ''اُردو زبان کی قدیم تاریخ'' (لاہور، ۱۹۷۲ء) میں اس نقطۂ نظر میں اس حد تک اضافہ کیا کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی تینوں وادی سندھ کی زبانیں ہیں، لہٰذا پنجابی اور سرائیکی، سرائیکی اور سندھی، سندھی اور پنجابی میں ایک قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں اُردو، سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ اس کا سرچشمہ وادیٔ سندھ کی قدیم زبان ہے اور اُردو، پنجابی سے نکلی ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کی قدیم زبان، پنجابی ہے لہٰذا وہی اُردو کا سرچشمہ ہے۔

اُردو کے آغاز اور اس کے مولد کے نظریے، جو مرزا جان طپش سے مسعود حسین خان، سہیل بخاری اور شوکت سبزواری تک، کسی حتمی فیصلے یا نتیجے تک نہ پہنچ سکے تھے اور اگرچہ دلائل قوی اور واضح بھی تھے لیکن مکمل اتفاق کسی ایک نظریے پر اب تک نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں ابھی حال میں ڈاکٹر خالد حسن قادری نے مذکورہ سارے نظریات کو باطل قرار دے کر ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے کہ اُردو زبان کا تعلّق ہند آریائی زبانوں کے خاندان سے نہیں اور نہ پراکرت کا تعلّق سنسکرت سے ہے۔ ڈاکٹر قادری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آریاؤں کی ہندوستان آمد سے پہلے بھی پراکرتیں مغربی ہندوستانی (پنجاب، سندھ) میں مروج تھیں، اس لیے پراکرت کا تعلّق سنسکرت سے نہیں ہوسکتا، جو آریاؤں کے ساتھ ہندوستان آئی تھی۔ پراکرت اپنے قواعد کے لحاظ سے عربی زبان کے زیادہ قریب ہے اس لیے یہ ان قبائل کی زبان ہوسکتی ہے جو مشرقِ وسطیٰ سے سفر کر کے کئی صدیوں میں مغربی ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ لہٰذا اُردو زبان کی بنیاد عربی سے متاثرہ پراکرت ہوسکتی ہے اور پنجاب، سندھ اور صوبۂ سرحد کا علاقہ اُردو کی جائے پیدائش ہوسکتا ہے۔

دراصل اُردو کی ابتدا کے بارے میں جو اولین بیانات ملتے ہیں، ان میں میر امن دہلوی کا بیان پہلا بتایا جاتا ہے۔ میر امن نے ''باغ و بہار'' کے مقدّمے میں اُردو زبان کے آغاز کا ذکر کیا تھا۔ ''باغ و بہار'' ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی تھی، لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مرزا جان طپش کے کلیات کے دیباچے کا، جو فارسی میں ہے، اُردو ترجمہ کیا تھا۔ طپش نے اپنا کلیات ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۳ء) میں مرتب کر لیا تھا۔ اس دیباچے میں اس نے دہلی پر مسلمانوں کے قبضے سے قبل ہندی الاصل زبانوں کے بولے جانے کا ذکر کیا اور پھر مسلمانوں کے قبضے کے بعد اس میں تغیرات رونما ہونے، عربی و فارسی الفاظ شامل ہونے، پھر محمد شاہ تغلق کے ساتھ مسلمانوں کے دکن جانے اور پھر واپس دہلی آنے کے سبب اس زبان میں دکنی الفاظ کے شامل ہونے پر اظہار خیال کیا ہے اور ان تصرّفات کی مثالیں دی ہیں جو شعراء نے اس زبان

میں کیے۔ اس دیباچے میں طپشؔ نے شعرِ ہندی کو ''ریختہ'' کہنے اور اُردو کی وجہِ تسمیہ بھی بیان کی ہے۔ ڈاکٹر شادانی کی اس کاوش سے یہ بات سامنے آئی کہ میر امن سے پہلے اُردو کے آغاز کے بارے میں اظہارِ خیال ہو چکا ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی کاوش سے محمد باقر آگاہؔ کا ''دیباچہ گلزارِ عشق'' منظرِ عام پر آیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ طپشؔ کے دیباچے سے بھی پہلے آگاہؔ نے برج بھاشا کو اُردو کی اصل بتایا ہے۔ ان قدیم بیانات سے قطع نظر محمد حسین آزادؔ نے پہلی بار اُردو کی ابتدا و ترقی کے موضوع پر غور و فکر کے بعد مبسوط اظہارِ خیال کیا۔ ان سے قبل انشاء اللہ خاں انشاؔ نے اپنے لسانی شعور کے تحت اُردو کی بولیوں کا جائزہ لیا تھا۔

اُردو کے آغاز و مولد پر تحقیق کے علاوہ محققین کے لیے جو ایک اور موضوع بہت اہم رہا ہے، وہ اُردو کا رشتہ دوسری زبانوں سے ہے۔ اُردو اور پنجابی کی لسانی مشابہتوں پر محمود شیرانی نے تفصیل سے روشنی ڈالی تھی اور اس ضمن میں ان کی زیادہ توجہ اُردو، پنجابی اور برج بھاشا کے تقابلی جائزے پر مرکوز تھی۔ اُردو اور پنجابی کے رشتے پر ڈاکٹر زورؔ نے بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت کیفیؔ بھی ان دونوں زبانوں میں مضبوط باہمی رشتے کے قائل تھے۔ ان کے مقابلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں اُردو کا رشتہ پنجابی کے ساتھ ساتھ ہریانی سے بھی ملاتے ہیں۔ اور پھر وہ موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں، جو ڈاکٹر زورؔ کے خیال میں ان کی اہم فروگزاشت ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اُردو کا تعلق پالی سے استوار کیا ہے۔ اس طرح لسانی رشتوں، مماثلتوں اور اختلافات کی تلاش و تحقیق کا سلسلہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے ان محققین کے پیشِ نظر رہا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری، جنھوں نے اُردو لسانیات، اُردو کے آغاز اور اشتقاقیات میں مستقل دل چسپی لی ہے، قدیم دکنی اور اُردو کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور صوتیات اور صرف و نحو کا مفصل تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دکنی، اُردو سے الگ ایک آزاد اور مستقل زبان ہے، جسے انھوں نے بیجاپوری قرار دیا اور جو آج بھی بیجاپور میں سنی جا سکتی ہے۔ یہ زبان اپنی پڑوسن ''کونکنی'' سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ کونکنی، بمبئی کے جنوب میں بھارت کے مغربی ساحل کی زبان ہے اور مرہٹی کی ایک اہم شاخ کہی جا سکتی ہے۔ یہ کونکنی زبان اپنی صوتیات کے اعتبار سے دکن میں اور چند خصوصیات کے باعث پورے ہندوستان میں اہمیت رکھتی ہے۔ بیجاپوری اور کونکنی قربِ مکانی کے باعث بہت کچھ مشابہت رکھتی ہیں۔ چنانچہ دکنی کی بہت سی ایسی خصوصیات جنھیں آج تک پنجاب کا تصرف سمجھا جا رہا ہے،

دراصل خود بیجاپوری کی مقامی خصوصیات ہیں جو کونکنی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ان کے خیال میں تاریخی واقعات کی مدد سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پنجابی، ہریانی وغیرہ زبانوں نے دکن کی متعدد زبانوں کو جنم دیا۔دوسری طرف اُردو اور دکنی کی مشابہت، جس کے باعث ان میں قدیم وجدید کا تعلّق فرض کیا گیا ہے، صرف اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں ہی، زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے تعلّق رکھتی ہیں، اس لیے دونوں میں نہ صرف دراوڑی بلکہ مہاراشٹری ہونے کے لحاظ سے بھی بہت کچھ مشترک ملتا ہے۔

اسی نہج پر محققین نے اُردو کا سندھی، ملتانی، کشمیری، ہندکو، براہوی، پشتو اور راجستھانی سے لسانی اشتراک واختلاف کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔

مشترک خصوصیات کے ساتھ ساتھ مشترک الفاظ کی تلاش بھی محققین کی دل چسپی کا موضوع بنی ہے اور زبانوں کے اشتراک کے مطالعے کا ایک اگلا قدم اُردو کا غیر ملکی زبانوں سے رشتہ اور تعلّق ہے۔اس ضمن میں ترکی اور اُردو کے مشترک عناصر کی نشان دہی کا کام ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے انجام دیا۔اوّلاً انھوں نے ترکی اور اُردو کے مشترک عناصر کا تحقیقی مطالعہ کیا اور پھر مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کی۔اسی سلسلے میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور ڈاکٹر محمد صابر نے ترکی اور اُردو کے تعلّق پر متنوع مقالات تحریر کیے اور ان دونوں کے روابط پر محققانہ روشنی ڈالی۔

دوسری زبانوں سے اُردو کی اثر پذیری کے تعلّق سے ڈاکٹر عبدالحق کے مبسوط تحقیقی مقالے ''فارسی شاعری کا اثر اُردو شاعری پر'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ مقالہ زبان کے ساتھ ساتھ ادبی اثرات کے جائزے پر مشتمل ہے۔اس نوعیت کا ایک منفرد اور قابلِ قدر کارنامہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے ''اُردو میں قرآن وحدیث کے محاورات'' پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ان کی تصنیف دو حصّوں پر مشتمل ہے۔حصّۂ اول میں قرآنی محاورات اور حصّۂ دوم میں حدیث کے محاورات کو اُردو میں استعمال کرنے کی روایت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔قرآنی محاورات کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے اسماء الحسنیٰ کی مناسبت سے صرف ۹۹ محاورات کا انتخاب کیا ہے اور پھر یہ دکھایا ہے کہ اُردو ادب میں کس کس شاعر نے ان محاورات سے استفادہ کیا ہے۔اس طرح حدیث کے محاورات کے ضمن میں قرآنی سورتوں کی تعداد کی مناسبت سے ۱۱۴ محاورات کا انتخاب کیا ہے اور پھر ان سے اُردو شعرا کے استفادے کی مثالیں دی ہیں۔ڈاکٹر صاحب کا یہ کام اُردو زبان کے متعلق تحقیق میں ایک منفرد کارنامے کے ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اسی ضمن میں قرآن وحدیث کے

صنائع و بدائع کا بھی مطالعہ کیا ہے اور تحقیق میں موضوعات کی انفرادیت کی ایک مثال قائم کی ہے۔ ان موضوعات پر کسی اور نے توجہ نہیں دی۔ اُردو زبان و ادب کی اثر پذیری کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور مقالہ ''ثقافتی اُردو'' ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے کمالِ تحقیق و جستجو سے یہ دکھایا ہے کہ اُردو زبان میں ہندوستانی اثرات کس حد تک کارفرما رہے ہیں اور الفاظ و محاورات پر ہندو مذہب، تہذیب اور افکار کی چھاپ کہاں کہاں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ ان کے وسیع مطالعے اور ان کی تلاش و تحقیق کا منفرد ثبوت ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اُردو کی اثر پذیری کے ساتھ ساتھ اثر اندازی کا بھی ایک مطالعہ کیا ہے ان کا مقالہ ''فارسی پر اُردو کا اثر'' اپنے موضوع پر ایک بہت جامع اور معلوماتی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس نوع کی ایک کوشش ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کی تھی اور ''قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ'' کا سراغ لگایا تھا۔ لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا مقالہ زیادہ مبسوط اور جامع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق جس طرح اُردو، فارسی سے متأثر ہوئی ہے اسی طرح اس نے فارسی کو بھی متاثر کیا ہے۔ کم از کم پانچویں صدی ہجری میں اُردو کے الفاظ فارسی میں تواتر کے ساتھ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے عہد بہ عہد فارسی شاعروں کے ہاں اُردو الفاظ تلاش کیے ہیں اور ساتھ ہی لسانی و ادبی اثرات کی نشان دہی کی ہے اور پھر وہ تاریخی اسباب بھی بتائے ہیں، جن کے زیرِ اثر فارسی شاعروں نے اُردو الفاظ استعمال کیے۔ اسی ذیل میں فارسی شاعری میں ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی لوازمات کا ذکر اور اُردو کے محاورات کے استعمال کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے الفاظ کے تلفظ، املا اور معانی کی تبدیلیوں پر بھی محققانہ نظر ڈالی ہے۔

اسی نہج پر ایک کوشش سکھوں کی مقدس کتاب ''گرو گرنتھ'' میں اُردو الفاظ کی تلاش ہے۔ یہ کام عباداللہ گیانی نے کیا اور اپنی تصنیف ''گرو گرنتھ اور اُردو'' میں گرنتھ سے ایسے شبد اور اشلوک جمع کیے، جن سے اُردو کی ابتدائی شکل معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے اور اس امر کا پتا چل سکتا ہے کہ اُردو نے کس طرح کے تشکیلی مراحل طے کیے ہیں۔ تصنیف کا بڑا حصّہ ان عربی و فارسی الفاظ کی فہرست پر مشتمل ہے جو گرو گرنتھ میں استعمال ہوئے ہیں۔

اُردو زبان کے قدیم نمونوں کو تلاش کرنے کا کام ادبی تاریخوں میں بھی ہوا ہے لیکن وہ نمونے عموماً ادب کے ہیں، اور بالعموم مسلمان شاعروں سے منسوب ہیں۔ جب سے یہ خیال ہوا ہے کہ اُردو کی داغ بیل مسلمانوں کی آمد سے قبل پڑ چکی تھی، ہندوستان کی قبل از اسلام زبانوں میں اُردو الفاظ کی

تلاش وتحقیق کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ بعض محقق اس کام میں پیش پیش رہے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس کام کو خصوصی اہمیت دے کر ''رِگ وید'' سے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے، جو صرفی اور نحوی اعتبار سے اُردو کے ابتدائی الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ اپنے مقالے ''اُردو کی زبان کا آغاز'' میں انھوں نے ان شواہد کے ساتھ ساتھ کہ اُردو مسلمانوں کی آمد سے قبل برِّعظیم میں موجود تھی، ''رِگ وید'' میں شامل اُردو الفاظ کی مختلف ابتدائی صورتوں کو فہرست وار ترتیب دیا ہے۔ یہی کام انھوں نے زیادہ مبسوط انداز میں ایک ضخیم تصنیف ''اُردو کی کہانی'' کی صورت میں انجام دیا ہے۔ اس میں انھوں نے ویدک اور سنسکرت سے اُردو الفاظ ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور پھر عہد بہ عہد اس کے نمونے جمع کیے ہیں۔ پھر اس نوعیت کا ایک کام پروفیسر سید شبیر علی کاظمی نے انجام دیا۔ انھوں نے ''پراچین اُردو'' میں بنگالی اشلوکوں اور دوہوں میں قدیم اُردو عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی۔

قدیم لغات میں اُردو الفاظ کی تحقیق بھی ایک اہم موضوع ہے۔ اس جانب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے توجہ دی۔ ان کا مقالہ ''چند قدیم لغات'' اُردو کے مختلف ناموں ہندوی، ہندی وغیرہ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور پھر چار قدیم لغات ''ادات الفضلا'' مولفہ قاضی خان بدر محمد، ''مفتاح الفضلا'' مولفہ محمد ابن داؤد، ''موئد الفضلا'' مولفہ محمد امین اور ''دستور الصبیان'' مولفہ نامعلوم میں قدیم اُردو الفاظ کے کچھ دستیاب نمونوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں ان تمام لغات کے برٹش میوزیم میں موجود نسخوں سے استفادہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ایک مفید بحث ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) نے شروع کی اور ایک مقالہ ''قدیم فارسی فرہنگوں میں اُردو عناصر'' لکھا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے ان کے اس مقالے پر تنقید کرتے ہوئے اس موضوع پر تحقیقِ مزید سے روشنی ڈالی۔

لغات کے سلسلے کی ایک اہم تحقیقی کاوش سخاوت مرزا نے انجام دی۔ انھوں نے ایک مختصر مقالہ ''تحقیقاتِ الفاظِ ہندی غرائب اللغات'' لکھا، جو اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اُردو کے بعض قدیم لغات اور لغت نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ اُردو کے اس پہلے لغت ''غرائب اللغات'' مولفہ عبدالواسع ہانسوی کے الفاظ کی تحقیق پر خان آرزو نے وقیع کام کیا تھا۔ اس لغت کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے عالمانہ مبسوط مقدمے اور تصحیح کے ساتھ مرتب کیا تھا، لیکن اس درمیانی عرصے میں کسی اور محقق نے اس لغت یا اس کے مولف پر نظر نہیں ڈالی۔ سخاوت مرزا کے اس مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے بعض ادیبوں نے ''غرائب اللغات'' پر توجہ دی تھی اور اس بات کی تحقیق کی ہے کہ اس لغت میں دراصل اُردو الفاظ کون سے ہیں اور ہندی و فارسی کون سے ہیں۔

اُردو کے ابتدائی ناموں کی تحقیق پر بھی محققین نے خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ تاریخی حوالوں میں اس کے جو مختلف نام ہندی، ہندوی، ہندوستانی، زبانِ ہندوستان، مورس، اُردوئے معلّٰی وغیرہ ملتے ہیں، ان کا حوالہ متعدد مصنفین کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اوّلاً اس موضوع پر حافظ محمود شیرانی نے دادِ تحقیق دی تھی۔ بعد میں گراہم بیلی نے اپنی تصنیف "A History of Urdu Literature" میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف ''اُردو زبان کا ارتقا'' میں اور پھر اسی موضوع پر ایک علاحدہ مقالہ لکھ کر اُردو کے مختلف ناموں کا تاریخی حوالوں سے جائزہ لیا۔ پروفیسر سیّد شبیر علی کاظمی کا مقالہ ''اُردو کے مختلف نام'' بھی اسی طرح کی تحقیقی کاوش ہے۔

پھر یہ مسئلہ بھی محققین کے پیشِ نظر رہا کہ لفظ ''اُردو'' بمعنی زبان پہلے پہل کس نے استعمال کیا۔ اس دریافت کا آغاز ڈاکٹر محمد باقر کے ایک مقالے ''اُردوئے قدیم کے متعلّق چند تصریحات'' کو سمجھنا چاہیے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مراد شاہ لاہوری نے لفظ ''اُردو'' کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ ضمنی طور پر محمود شیرانی اور غلام دستگیر نامی بھی مراد شاہ لاہوری کے مؤیّد ہیں۔ لیکن بعد میں ڈاکٹر اے حلیم نے اصرار کیا کہ یہ لفظ سب سے پہلے میر عطا حسین تحسینؔ نے اپنی کتاب ''نوطرزِ مرصع'' میں استعمال کیا ہے، لیکن تحسینؔ نے اُردو کے بجائے ''زبان اُردوئے معلّٰی'' لکھا ہے۔ اس موضوع پر محمد اکرام چغتائی نے عمدہ تحقیق و دریافت سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو بمعنی زبان کے متعلّق نئی تحقیق'' میں ایسے تمام نظریات سے انحراف کرتے ہوئے اس سلسلے کا ایک نیا نام مائل دہلوی کا پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں لفظ اُردو، زبان کے معنوں میں سب سے پہلے میر محمدی مائل دہلوی (متوفی قبل ۱۲۲۱ھ) نے استعمال کیا۔ مائلؔ، قائم چاند پوری کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس دیوان میں ایک طویل قطعہ شامل ہے، جس میں چار مرتبہ لفظ ''اُردو'' زبان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ان چاروں مقامات کو مقالے میں نقل کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی اس نئی تحقیق کے مطابق مائل دہلوی نے مراد شاہ لاہوری سے کم از کم ستائیس سال پہلے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

اُردو زبان کے متعلّقہ پہلوؤں اور موضوعات پر مطالعہ و تحقیق کی وہ قدیم روایت جو اٹھارویں صدی کے اواخر سے شروع ہو کر محمد حسین آزادؔ تک پہنچی تھی اور جو بیسویں صدی میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے مخصوص اور فکر انگیز مطالعات کا موضوع بنی تھی،

ڈاکٹر محی الدین قادری، ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے باوصف جدید لسانیات کے اصولوں اور نظریات اور ان علمائے لسانیات کے شعور سے فیض یاب ہوئی۔ آج اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کے تمام تصورات اور نظریات ان علماء کے جدید تر مطالعے و شعور کے نتیجے میں جدید علمِ لسانیات کی کسوٹی پر پرکھے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن، آج کی ترقی یافتہ علمی دنیا میں لسانی تحقیق کے میدان میں جو مواد انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور روسی زبانوں میں جمع ہو گیا ہے، اس کے مقابلے میں اُردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قطعی طور پر ہیچ ہے۔ جدید علمِ لسانیات کے اصولوں کے تحت خان آرزو ہمارے پہلے عالم تھے، جنھوں نے فارسی اور سنسکرت کے قریبی تعلق کی طرف، سر ولیم جونز سے بھی پہلے اشارہ کیا تھا، لیکن وہ اس پر مفصل روشنی ڈالنے کی استعداد نہ رکھتے تھے۔ انشاء اللہ خان انشاؔ نے اُردو قواعد کے بعض اہم مسائل کو اہمیت دی اور اپنے عہد کے شہر دہلی کی بولیوں کے اختلافات کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن افسوس کہ یہ روایت ہمارے ہاں جاری نہ رہ سکی۔ چنانچہ قومی اور ادبی اصلاح و ترقی کی تحریک کے آغاز سے پہلے سرسید احمد خان نے بجا طور پر یہ گلہ کیا تھا کہ اُردو میں کوئی مناسب قواعد موجود نہیں۔ ان کے دور میں محمد حسین آزاد بھی اس وجہ سے متاسف رہے کہ اُردو زبان، تہذیب کے دربار میں صفِ آخر میں کھڑی ہے اور اس کا ادب تنگ دامانی کا شکار ہے۔ گو اس سارے عرصے میں بعض ''مستشرقین'' نے، جن میں جان گلکرسٹ، گارساں دتاسی، میکس مولر، جان بیمز اور گریرسن وغیرہ شامل ہیں، مختلف صورتوں میں ہندوستانی زبانوں کا لسانی جائزہ لیا، جس میں ضمنی طور پر اُردو کے لسانی مطالعے کی کوششیں بھی شامل تھیں، لیکن اُردو کے اکابر و ماہرین نے اس باب میں خاطر خواہ جستجو نہ کی اور نہ لسانیات کے ان فوائد کی بابت سوچا جو مغرب کی علمی دنیا اس سے حاصل کر رہی ہے۔

اُردو اگرچہ سارے جنوبی ایشیا کی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا حلقۂ اثر رکھتی ہے اور یہ ہند آریائی علاقوں سے باہر، دراوڑی زبانوں کے علاقوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، لیکن اس لحاظ سے بدقسمت زبان ہے کہ اس قدر وسعت، مقبولیت اور علمیت رکھنے کے باوجود اس پر علمی اعتبار سے قابلِ اطمینان کام ابھی تک نہیں ہوا۔ اُردو کا توضیحی مطالعہ، اُردو کی مختلف بولیوں کے جائزے اور دیگر لسانی موضوعات پر لسانی تحقیق، چند مضامین یا ایک آدھ کتاب سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس میں توضیحی لسانیات کے مطالعے کا آغاز ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ سے ہوا، ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند

وغیرہ نے لسانیات کے توضیحی اور تاریخی دونوں پہلوؤں پر لکھا، لیکن ان سب کوششوں کے باوجود اس کا مطالعہ ابتدائی منزل میں ہے اور اس کے تجزیاتی، توضیحی اور افادی پہلوؤں سے استفادے کی صورت ہمارے ہاں ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ مغرب کی زبانوں سے اس کا مقابلہ تو ایک طرف، یہ ابھی لسانیاتی تحقیق اور سائنٹی فک مطالعے کے لحاظ سے اپنے اطراف کی، بلکہ اپنے پڑوسی ملک (بھارت) کی دیگر زبانوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، جہاں توضیحی لسانیات کے مطالعے کا آغاز ۱۹۵۴ء سے ہو چکا ہے، اور جہاں بلا مبالغہ اُردو اور ہندی میں لسانیاتی کتابوں کی تصنیف کا تقابلی تناسب ایک اور پچاس کا ہے۔

آج کے دور میں، جب کہ لسانیات نے زبان کے تاریخی جائزوں کی سرحدوں سے باہر نکل کر ریاضی اور سائنس کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ کسی زبان کے مطالعے میں ان منزلوں تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبان علمی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی حیثیت مستحکم کر رہی ہے۔ آج علوم کی بے پناہ ترقی کے دور میں زبانیں اب اپنے مخصوص وقار اور دائروں میں محدود نہیں رہ سکتیں۔ تہذیبی انقلاب، لسانی تبدیلیوں اور صنعت و سائنس کی بے پناہ ترقی میں انھیں اپنے لیے جگہ متعین کرنا ہے۔ ماضی کی طرف نگاہ رکھنا ضروری سہی، لیکن زمانے کی رفتار کے پیشِ نظر مستقبل سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے مستقبل کے تقاضوں کو قبول کرنا ہوگا۔ ہم نے اُردو کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشتِ الفاظ جیسے موضوعات کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے اعلیٰ تعلیمی نصاب میں بھی اس سے زیادہ اگر کچھ رکھا بھی گیا ہے تو فقط نمائش کے لیے۔ ہمارے لیے اس کے مطالعے اور اس کی اہمیت و افادیت کی طرف توجہ صرف علمی لحاظ سے ہی ضروری نہیں بلکہ قومی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ اس کے مطالعے سے انسانی گروہوں کی یکسانیت اور مشترکہ خصوصات کا اندازہ ہوتا ہے اور لسانی ہم آہنگی بھی اس سے اجاگر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے توسط سے انسانی گروہوں کے درمیان مطابقت، یکسانیت اور ہم آہنگی کے جذبات عام ہوتے ہیں اور اس طرح باہمی اخوت پیدا ہوتی ہے۔

زبان اور اس کے آغاز و ارتقاء پر محققین اور ماہرینِ زبان و لسانیات کی کوششیں دراصل انفرادی دل چسپی کے کام ہیں، جن کا تعلّق ماضی یا ماضیِ قریب سے رہا ہے۔ آج ہمارے قدیم اور روایتی و تاریخی علمِ زبان نے جدید علوم اور ان کی تحقیقات کے زیرِ اثر اور خاص طور پر جدید علمِ لسانیات کے فروغ کے حالیہ ماحول میں خود کو توضیحی لسانیات اور اس کی مختلف شاخوں میں ضم کر لیا ہے۔ اس لیے

آج ہم زبان کے تعلّق سے کوئی مطالعہ جدید علمِ لسانیات سے رجوع کیے بغیر انجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے اب ہمارے لیے یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم جدید علوم اور جدید علمِ لسانیات کی روشنی میں اپنے موضوعات کا انتخاب کریں اور اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کو اس کے مزاج اور اس کی خصوصیات کو نئے سرے سے جانچیں اور پرکھیں۔ چنانچہ زبان کے تعلّق سے مطالعے و تحقیق میں ضرورت اب اس بات کی ہے کہ:

۱) ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے، جو زبان کے صوتی تجزیے پر مبنی ہوں۔ کیوں کہ زبان کی بنیاد ہی صوت یا آواز ہے اور صوتی خصوصیات کے مطالعے کے بغیر نہ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں نہ زبان کے متعلق پہلوؤں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ صوتی تجزیے سے زبان کا اصل مزاج سامنے آئے گا اور حرف وصوت کا رشتہ واضح ہوگا۔

۲) صوتی مطالعے کے بعد قواعد کی جدید خطوط پر ترتیب ضروری ہے۔ قواعد کے ضمن میں زبان کا صرفی ونحوی مطالعہ لازمی ہے۔ اس کے توسط سے زبان کا وظیفہ وعمل اپنی منطقی توجیہات کے ساتھ واضح ہوگا۔

۳) پھر اُردو کا رشتہ دیگر زبانوں سے استوار کرنے اور علاقائی بولیوں کے مطالعے سے باہمی اثرات نمایاں کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح زبان اپنے علاقائی، تہذیبی اور معاشرتی تناظر میں پوری طرح قابلِ فہم ہو سکے گی۔ اس ضمن میں مثلاً کرخنداری اور اُردو اور دکنی اور اُردو کے مطالعوں کی مثالیں، جنھیں علی الترتیب گوپی چند نارنگ اور محی الدین قادری زورؔ نے انجام دیا، سامنے رکھی جا سکتی ہیں۔

۴) بولیوں اور زبان کے علاقائی اور معاشرتی مطالعوں میں مختلف انسانی گروہوں، طبقوں اور پیشوں کو بھی حوالہ بنایا جا سکتا ہے۔

ان موضوعات کی مثالوں کو سامنے رکھ کر ہم ماضی اور مستقبل دونوں کے تقاضوں کے تحت لسانی مطالعہ اور تحقیق کے در وا کر سکتے ہیں۔ وہ تمام عنوانات اور موضوعات جو ہمارے ماہرینِ زبان کے پیشِ نظر رہے، جدید علمِ لسانیات کے اصولوں کے تحت دوبارہ ہمارا موضوع بن سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی جدید علمِ لسانیات کا شعور حاصل کر کے ہم اپنے معاشرتی اور قومی تقاضوں کے تحت زبان کے مطالعے کو وسعت بھی دے سکتے ہیں اور اس سے قومی و معاشرتی فوائد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

فہرستِ مآخذ

۱۔ آرزو، سراج الدین علی خاں: ''نوادرالالفاظ'' مرتبہ: ڈاکٹر سیّد عبداللہ، کراچی، انجمنِ ترقیِ اُردو، ۱۹۵۱ء۔

۲۔ آزاد، محمد حسین: ''آبِ حیات'' مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ملتان، شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء۔

۳۔ امن، میر: ''باغ و بہار''، مرتبہ: رشید حسن خاں، دہلی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۲ء۔

۴۔ بخاری، سہیل، ڈاکٹر: ''اُردو کی زبان''، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء۔

۵۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: ''تاریخ ادبِ اُردو''، جلد اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء۔

۶۔ خاں، مسعود حسین: ''مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو''، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء۔

۷۔ خاں، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر: ''اُردو میں قرآن اور حدیث کے محاورات''، اسلام آباد، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، ۱۹۸۰ء۔

۸۔ خاں، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر: ''فارسی پر اُردو کا اثر''، طبع دوّم، کراچی، عبدالرحمٰن خاں، ۱۹۶۰ء۔

۹۔ دل، انور شبنم: **"An out line of Urdu Sentence Structure"**، لاہور، ۱۹۶۴ء۔

۱۰۔ راشدی، حُسام الدین: ''اُردو کا مولد سندھ''، مشمولہ سہ ماہی ''اُردو''، کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء۔

۱۱۔ زور، محی الدین قادری: ''ہندوستانی لسانیات''، لاہور، مکتبۂ معین الادب، ۱۹۶۱ء۔

۱۲۔ سلیمان ندوی، سیّد: ''نقوشِ سلیمانی''، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء۔

۱۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر: ''اُردو زبان کا ارتقا''، ڈھاکہ، گہوارۂ ادب، ۱۹۶۵ء

۱۴۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر: ''اُردو کی ادبی تاریخ'' تاریخ کا خاکہ، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۴ء

۱۵۔ عقیل، معین الدین: ''پاکستان میں اُردو تحقیق، موضوعات اور معیار''، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۸۷ء۔

۱۶۔ عین الحق، فرید کوٹی: ''اُردو زبان کی قدیم تاریخ''، لاہور، ارسلان پبلیکیشنز، ۱۹۷۲ء۔

۱۷۔ کاظمی، شبیر علی: ''پراچین اُردو''، کراچی، ۱۹۷۹ء۔

۱۸۔ کیفی، برجموہن: دتاتریا ''کیفیہ''، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء۔

۱۹۔ گیان چند جین: ''لسانی مطالعے''، دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۳ء۔

۲۰۔ گیانی، عبداللہ: ''گوگرنتھ اور اُردو''، لاہور، مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۶۶ء۔

۲۱۔ محمود شیرانی، حافظ: ''پنجاب میں اُردو'' مرتبہ محمد اکرام چغتائی، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۵ء۔

۲۲۔ نذیر احمد: ''فارسی کی قدیم فرہنگوں میں ہندوستانی عنصر''
مشمولہ ''ارمغان مالک رام''، جلد دوم، دہلی، ''مجلسِ ارمغانِ مالک''، ۱۹۷۱ء۔

۲۳۔ ہاشمی، نصیر الدین: ''دکن میں اُردو'' حیدر آباد دکن، مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۳۶ء۔

Common elements in the structure of Turkish & Urdu, University Studies Karachi, August 1996